بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جن نامساعد بلکہ تشویشناک حالات میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے وہ سب کے سامنے ہیں۔ جسد پاکستان کا نصف حصہ اس سے الگ ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت جسے اسلام کا حصار سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دنیا میں رسوائی ہوئی ہے۔ ملک کا جو حصہ بچ گیا ہے اس کی حالت بھی شکستہ کشتی کے اُن ٹوٹے پھوٹے تختوں سے کسی طرح بھی بہتر نہیں جو خوفزدہ مسافروں کو جن کے عزیز و اقارب سمندر کی لہروں کی نذر ہو چکے ہوں ان کو اپنے اوپر لاد کر تاریک رات میں تلاطم خیز موجوں کی زد میں ہچکولے کھاتے پھر رہے ہیں۔ ان بیکسوں کے پاس نہ تو پتوار ہیں اور نہ بادبان انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ سمندر کی تند و تیز موجیں انہیں کس طرف بہائے جا رہی ہیں اور اُن کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ جس قوم کے افراد کی ذہنی کیفیت ان مسافروں کی سی ہو کیا وہ ایک لمحہ کے لیے ایک دوسرے سے عدم تعاون کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟ مشترک خطرات تو جان کے دشمنوں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسوں کو متحد کر دیتے ہیں۔ کیا پاکستان کی تباہی ہمیں ایک دوسرے سے قریب نہیں کر سکتی؟ جب مکان کو آگ لگی ہوتی ہو تو اس کے مکین اپنا وقت اختلافات کی راہیں نکالنے میں ضائع نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس آگ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ان حالات میں یہ سوچنا کہ پاکستان کا کوئی شہری بھی صدر مملکت سے بھرپور تعاون کرنے میں گریز کر سکتا ہے، بہت بڑی زیادتی ہے۔

سوال صرف یہ ہے کہ وہ کونسے ایسے مسائل ہیں جن میں اس وقت تعاون کی ضرورت ہے اور جن کے حل کے لیے ہر فرد کو صدر صاحب سے تعاون کرنا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ صاحب صدر محض

اپنا امیج بنانے کے لیے تو پاکستان کے ہر طبقۂ خیال سے تعاون کی اپیلیں نہیں کر رہے۔ اخبارات میں اُن کے جو بیانات اپنی ذات کے بارے میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے بارے میں کچھ زیادہ فکرمند نہیں۔ اس وقت اُن کی پوری توجہ ملکی فلاح و بہبود پر لگی ہوئی ہے۔ بالفرض اگر ان کے شیدائی یہ سمجھتے بھی ہوں کہ جب تک ان کی ذات کا سحر انگیز امیج قائم نہ کیا جائے اُس وقت تک پاکستان کا وقار بلند نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی ملک کے سربراہ کی پُرکشش شخصیت ہی ملک کی سربلندی کا باعث بنتی ہے تو پھر بھی ساری قوم کو اس مقصد میں اپنی صلاحیتیں کھپانے کی ضرورت نہیں کیونکہ حکومت کی تحویل میں ابلاغِ عامہ کے وسیع ذرائع اور صاحبِ صدر کی مضبوط جماعت کے لاکھوں افراد اس کام میں ہمہ تن مصروف ہیں اور وہ اس خدمت کو اس جوش و خروش کے ساتھ سرانجام دے رہے ہیں جو کسی دوسری جماعت کے لیے قریب قریب ناممکن ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب صدر محترم اپنی ذات کے معاملے میں کافی حد تک بے نیاز ہیں اور اگر اس کی کسی قدر ضرورت ہے تو حکومت کے نشر و اشاعت کے ذرائع اور پیپلز پارٹی کے کارکن اسے بطریق احسن پورا کر رہے ہیں تو پھر فکر و عمل کے وہ کونسے میدان ہیں جن میں صدر صاحب کو گروہی تعصبات سے بلند ہو کر پاکستان کے ہر شہری کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور دوسری طرف پاکستان کے ہر شہری کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سیاسی اختلافات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے پاکستان کی سالمیت کی خاطر صدر صاحب کا ہاتھ بٹائے۔

اس تعاون کے یوں تو متعدد میدان ہیں مگر چند میدان ایسے ہیں جن میں یہ تعاون بالکل ناگزیر ہے۔ ان میدانوں میں کرنے کے جو مختلف کام ہیں۔ انہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّلین توجّہ کے کام جنہیں ایک لحظہ ضائع کیے بغیر جلد از جلد سرانجام دینا چاہیے۔ دوسرے وہ کام جو ملک کی تعمیرِ نو میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے اِن کاموں کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر صدر مملکت سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ ان ضروری کاموں کی تکمیل میں اُن سے کس طرح تعاون

کیا جا سکتا ہے۔

اوّلین توجہ کے جو کام صدر محترم کے پیش نظر ہیں یا فی الحقیقت ہونے چاہییں اُن میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں ظلم و تشدد کو بند کروایا جائے اور اُن بدنصیب لوگوں کی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کا کوئی مؤثر انتظام کیا جائے جو بیچارے اسلام کے تصورِ قومیت کے علمبردار ہونے کی وجہ سے پاکستان کے پُرجوش حامی اور بنگلہ قومیت کے مخالف ہیں اور جنہوں نے اس مقصد کی خاطر کسی بڑی سے بڑی قربانی دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ یہ بےکس لوگ جن میں بنگالی اور غیر بنگالی دونوں شامل ہیں۔ اور جن کی تعداد لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں سے متجاوز ہے۔ ان پر اس وقت ناقابلِ بیان مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ ان بدنصیبوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بنگلہ قومیت کے دیوانوں اور اُن کی پشت پناہی کرنے والی بھارتی سینا کے ہاتھوں اپنے خاندانوں کو برباد ہوتے دیکھا ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ مغربی پریس کے ذریعے سفاکی اور بہیمیت کی جو روح فرسا خبریں آ رہی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم بنگال کی سرزمین میں چن چن کر اُن لوگوں کا خاتمہ کیا جا رہا ہے جن پر اسلام سے وابستگی اور پاکستان سے تعلق کا شبہ بھی ہو سکتا ہے۔ بھارت کے پیشِ نظر اس وقت سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ان حضرات کا نام و نشان مٹا دیا جائے جو مستقبل قریب یا بعید میں مسلم قومیت کے تصور کو کبھی اُجاگر کر سکتے ہیں۔ اس وقت بلاشبہ بنگالیوں کی اچھی خاصی تعداد کے سر میں بنگلہ قومیت کا سودا سمایا ہوا ہے لیکن جلد ہی جب اس کے تلخ نتائج سامنے آنے کی وجہ سے اصل حقیقت اُن پر منکشف ہونے لگے گی اور بھارت اور روس اپنی معاونت اور دستگیری کی اس خطہ سے بھاری قیمت وصول کرنے لگیں گے تو اس وقت اس بات کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ مسلم بنگال میں اسلام کے تصورِ قومیت کے دھندلے نقوش پھر سے روشن ہونے لگیں۔ اس خدشہ کو بھارت ابھی سے بھانپ کر اس امر کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ جن طبقوں کے اندر اس تصور کی دبی ہوئی چنگاریوں کے موجود ہونے کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں، ان طبقوں کو یکسر نیست و نابود کر دیا جائے۔

بھارت کی یہ سازش کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ اسے محض ایک موہوم خطرہ کہہ کر ٹال دیا جائے۔ مشرقی پاکستان میں اسلام کے علمبرداروں پر جو کچھ بیت رہی ہے، اُسے دیکھتے ہوئے اس کے ناپاک عزائم کا اچھی

طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں حکومت کو سب سے زیادہ توجہ ان مظلوموں کی داد رسی کی طرف کرنی چاہیے اور بھارت کو اس بات پر مجبور کر دینا چاہیے کہ وہ نسل کشی کی اس مہم کو روک دے۔ ان ستم کشوں کا اس کے علاوہ اور کوئی جرم نہیں کہ یہ اسلام کے تصورِ قومیت پر ایمان رکھنے کی وجہ سے پاکستان کے حصے بخرے کرنے پر تیار نہ تھے۔ ان لوگوں کے ایثار اور خلوص اور اُن کی مظلومیت کو بھلا دینا خدا اور خلق دونوں کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ صدر محترم اس سلسلے میں جو اقدام بھی کریں پوری قوم ان کی مؤید اور حامی ہوگی اور اُن کے اس کارنامے کو دل کی گہرائیوں سے ایک عظیم کارنامہ تسلیم کرے گی۔ کوئی بدنصیب شخص بھی ایسا نہ ہوگا جو اس معاملے میں اُن سے تعاون کرنے میں ذرا بھی متامل ہو۔

صدر محترم کو جس دوسرے کام کی طرف جلد از جلد توجہ دینی چاہیے وہ جمہوریت کی بحالی ہے۔ وہ خود آمریت اور مارشل لا کی تباہ کاریوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اس آمرانہ نظام اور فوج کے تسلط نے ملک کو کس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ صدر صاحب کو اس ضمن میں سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اس طرزِ حکومت کے ضرر رساں پہلوؤں کی طرف خود بار بار اشارہ کر چکے ہیں۔ ان سے یہ حقیقت بھی کسی طرح مخفی نہیں کہ مارشل لا کی وجہ سے فوج اپنے اصل فرائض سے غافل ہو کر ایسے کاموں میں اُلجھ جاتی ہے جو اس کے کرنے کے کام نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ نوکر شاہی کی قباحتیں بھی اُس کے اندر سرایت کرنے لگتی ہیں اور وہ ملک کے دفاع کا مقدس فرض سرانجام دینے کے بجائے سیاسی دھڑے بندیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

پھر صدر محترم سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں کہ آمریت محلاتی سازشوں کو جنم دیتی اور انہیں پروان چڑھاتی ہے۔ جس ملک میں بھی اس کے منحوس سائے پڑتے ہیں وہ ملک سازشوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ وہاں کے عوام کی حیثیت حکمران ٹولے کے نزدیک تاش کے پتوں کی سی ہوتی ہے جنہیں وہ جس طرح چاہتا ہے، کھیلتا ہے۔ اور ان پتوں کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ انہیں کس غرض کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اُن پر حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب کھیل کا فیصلہ ہو چکتا ہے۔ صاحبِ صدر اس بات سے اتفاق فرمائیں گے کہ اس ملک کے عوام کے ساتھ اس کے حکمرانوں نے گذشتہ پندرہ سالوں میں بڑے شرمناک کھیل کھیلے ہیں۔ انہوں نے

بڑے نازک سے نازک مراحل میں جب قوم اور ملک کی قسمت کے فیصلے ہو رہے تھے انہیں اصل حالات سے بالکل بے خبر رکھا اور ان بے چاروں کو صحیح صورتِ حال اس وقت معلوم ہوئی جب اُن کی قسمت کا فیصلہ مقدر کی صورت بن کر اُن کے سامنے آ چکا تھا۔ اگر اس ملک میں جمہوری نظام رائج ہوتا اور ہر قدم اٹھانے سے پہلے اس پر بحث و تمحیص کی اجازت ہوتی اور عوام کو اعتماد میں لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی تو یہ قوم اس بربادی سے دوچار نہ ہوتی جس سے کہ وہ اس وقت دوچار ہوئی ہے۔ حکومت کا مقصد خاص نظریے اور خاص معیار اور مخصوص اقدارِ حیات کے مطابق عوام کی فلاح و بہبود کا حصول ہوتا ہے۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ کوئی حکومت اس صاف اور سیدھے مقصد کے حصول کے لیے سعی و جہد کرنے کے بجائے عوام کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ بھٹو صاحب کا قوم پر یہ بڑا احسان ہوگا کہ اگر وہ جمہوریت کی پٹڑی سے اُتری ہوئی اس بدنصیب قوم کی گاڑی کو پھر سے جمہوریت کی پٹڑی پر ڈال دیں۔ وہ اس کام کو اگر چاہیں تو دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں کیونکہ وہ عوامی نمائندوں کے قائد کی حیثیت سے تختِ اقتدار پر متمکن ہوئے ہیں۔ اس اقتدار اور مقبولیت کے ہوتے ہوئے بھی اگر وہ اس کام میں ناکام رہے تو پھر یہاں جمہوریت کی بحالی کی کوئی توقع بظاہر باقی نہ رہے گی۔ کیونکہ اگر عوامی ووٹوں سے منتخب ہونے والا شخص بھی عوامی احتساب سے گریز کرے اور امورِ مملکت کو چلانے کے لیے مارشل لا کے ضابطوں کا سہارا لینے پر مجبور رہے تو پھر فوجی آمروں سے تو اس بات کی امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ فوج کی مدد سے عوام کی گردنوں پر مسلط ہونے کے بعد اپنے افعال و اعمال کے معاملے میں عوام کے سامنے جوابدہ ہونے پر راضی ہو سکیں گے۔ اُن کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز رہے گی کہ کسی طرح فوج کی تائید بہرحال میں انہیں حاصل رہے، کیونکہ وہی ان کے اقتدار کی محافظ اور اُن کی قوت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ فوجی آمریت کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کوئی قوم اس میں ایک مرتبہ گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس چکر سے بمشکل نکلتی ہے۔ آمر بلاشبہ ادلتے بدلتے رہتے ہیں مگر آمریت کی جگہ جمہوریت قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہاں ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ فوج کے سربراہوں نے کسی عوامی نمائندے کو اقتدار منتقل کر دیا ہے۔ صدر بھٹو صاحب کو اس موقع کو غنیمت جان کر اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے اور فوجی آمریت کی زخم خوردہ قوم کے اندر جمہوریت بحال کر کے نہ صرف اس کے زخموں کے اندمال کا سامان کرنا چاہیے بلکہ اس کے کھوئے ہوئے حقوق عطا کر کے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش

کرنی چاہیے۔ یہ کام جتنی جلدی کر لیا جائے اسی قدر ملک و قوم، اصحابِ اقتدار اور فوج کے لیے بہتر ہوگا، اور اس میں جس قدر تاخیر کی جائے گی اسی نسبت سے حالات نہ صرف صدر صاحب کے لیے پیچیدہ ہوتے چلے جائیں گے بلکہ اُن کی گرفت سے باہر ہو جائیں گے۔ اور پھر وہ بے بسی کے عالم میں جمہوریت کی خواہش کے باوجود اس معاملے میں کوئی مؤثر اقدام نہ کر سکیں گے۔

انہیں اس بات کا اطمینان رکھنا چاہیے کہ قوم کی فلاح کے لیے وہ جو انقلابی قدم بھی اٹھائیں گے قوم ان کی تائید کرے گی بشرطیکہ اُسے ان اقدامات کے روشن پہلوؤں سے آگاہ کر دیا جائے۔ صاحبِ صدر جب قوم کے لیے نیک عزائم رکھتے ہیں تو وہ ان عزائم کی تکمیل کے لیے تاریکی کا راستہ کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ وہ کیوں وہ راستہ اختیار نہیں کرتے جو تاریخ میں روشن شاہراہ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس پر اچھے کام کرنے والے ہمیشہ گامزن رہے ہیں۔ انہیں یہ مقدس کام دن کی روشنی میں کرنے چاہییں، تاکہ عوام اُن کی قدر و قیمت اچھی طرح متعین کر کے صاحب صدر کے شکر گزار ہو سکیں۔

پھر جمہوریت کو بحال کر کے وہ فوج پر بھی بہت بڑا احسان کریں گے کیونکہ ان کے اس اقدام سے فوج کے کندھوں سے بہت سے ایسے بوجھ اُتر جائیں گے جو فوجی آمروں نے اس پر خواہ مخواہ ڈال رکھے تھے۔ کسی ملک کی فوج بنیادی طور پر اس کے دفاع کے لیے تیار کی جاتی اور اسی ایک مقصد کے پیشِ نظر اُس کی ایک انداز پر تربیت ہوتی ہے۔ یہ ملک اور فوج دونوں کی بدقسمتی ہے کہ دفاعِ وطن سے سپاہ کی توجہ ہٹا کر اُسے ایسے کاموں پر مامور کر دیا جائے جس کا اُسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ اس سے ملک کے اندر دہشت اور خوف و ہراس کی فضا تو بلاشبہ پیدا ہو جاتی ہے۔ جس میں آمر بغیر کسی خوف یا ڈر کے من مانی کارروائیاں کر سکتے ہیں۔ مگر فوج کو اپنے اصل کام سے ہٹا کر دوسرے کاموں میں مصروف رکھنے سے اس کی استعداد کار کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک کی فوج کا معیار انتظامی معاملات میں عرصہ دراز تک دخیل رہنے کے باوجود اتنا نہیں گرا جتنا کہ عام طور پر گر جاتا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہماری سپاہ کا بیشتر حصہ ان برائیوں سے ابھی تک پاک ہے جو اس قسم کے حالات میں اس کے اندر راہ پا لیتی ہیں مگر جرنیلوں کی کھیپ کو صاحبِ صدر نے جس انداز سے سبکدوش کیا ہے اُس سے یہ تلخ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ ہماری فوج کا معیار اب ایسا قابلِ رشک نہیں رہا جو کبھی پہلے تھا۔ اور انتظامی ذمہ داریوں سے اگر اُسے فارغ کر کے

یکسوئی کے ساتھ جنگی تربیت حاصل کرنے اور عسکری صلاحیتیں بروئے کار لانے کے پورے پورے مواقع فراہم نہ کیے گئے تو اس کا معیار اتنا گر جائے گا کہ اس کی تلافی ممکن نہ ہوگی اس لیے ملکی مفاد کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ مارشل لا کو ختم کر کے فوج کو اپنے اصل کام میں مصروف کر دیا جائے۔

اگر شیخ مجیب الرحمٰن صاحب غیر معمولی مصائب میں گھرے ہوتے ہونے کے باوجود مارشل لا سے بے نیاز ہو کر جمہوریت کی راہ اختیار کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ صدر بھٹو صاحب ایسا نہ کر سکیں؟ مغربی پاکستان میں صورتِ حال مشرقی پاکستان سے زیادہ سنگین نہیں۔ اس اقدام سے اُن کی عزت بھی بڑھ جائے گی اور پاکستان کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے میں مدد بھی ملے گی۔ صدر محترم اس حقیقت سے ہم سے زیادہ واقف ہیں کہ پاکستان کے خلاف ہمارے دشمنوں نے معاندانہ پراپیگنڈے کی جو ناپاک مہم مدّت سے شروع کر رکھی ہے اس میں بار بار اس بات کو اچھالا جاتا ہے کہ ہمارا ملک زمین بے آئین ہے۔ مارشل لا کو مہذب دنیا نے کبھی بھی آئین کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا بلکہ اسے ہمیشہ آئین کی نفی بلکہ تذلیل اور انسانی حقوق پر ڈاکہ تصور کیا ہے۔ اس بنا پر جس ملک میں مارشل لا نافذ کیا جاتا ہے انسانی برادری میں اس کی ساکھ گر جاتی ہے۔ اس لیے ملکی وقار کا یہ عین تقاضا ہے کہ اس مقدس سرزمین سے مارشل لا کو جلد از جلد رخصت کیا جائے اور اس زمین بے آئین کو پھر سے آئین عطا کیا جائے۔ آئین کے نفاذ کا مسئلہ بھی اتنا پیچیدہ نہیں جتنا کہ اسے بنا دیا گیا ہے۔ جس آئین کو منسوخ کر کے ملک میں مارشل لا نافذ کیا گیا تھا اسی آئین کو مارشل لا کے خاتمے کے ساتھ ہی خود بخود بحال ہو جانا چاہیے۔ یہ چیز عقل اور انصاف کے عین مطابق ہے۔ پھر یہ آئین بھی ایسا ہے جسے پوری قوم نے بعض جزوی اختلافات کے باوجود قبول کر لیا تھا اور اُس کی بنیاد پر انتخابات ہونے والے تھے کہ سکندر مرزا صاحب نے ملک پر مارشل لا مسلط کر کے اسے منسوخ کر دیا۔

صدر صاحب کی توجہ کے مستحق کاموں میں ایک بڑا کام نظم و نسق کی ناقابلِ بیان حد تک خرابی کا مسئلہ بھی ہے۔ غنڈہ عناصر کھلے بندوں دندناتے پھر رہے ہیں اور کوئی ان کا محاسبہ کرنے والا نظر نہیں آتا۔ چونکہ ان عناصر کی اچھی خاصی تعداد کو پچھلے انتخابات میں حکمراں پارٹی کے بعض افراد نے استعمال کیا تھا

(بقیہ اشارات)

اس لیے یہ اُن کی شہ پر زیادہ مُنہ زور دکھائی دے رہے ہیں۔ ممکن ہے وقتی طور پر اربابِ حکومت اور اُن کے حامی ان لوگوں کی ستمرانیوں اور زیردست آزاریوں سے محفوظ رہیں لیکن انہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر غنڈہ گردی کی اِس بڑھتی ہوئی رو کو بروقت نہ روکا گیا تو پھر یہ سیلاب کی صورت اختیار کر کے پورے ملک کے امن کو غارت کر دیگی۔ وہ ملک جس میں لوگوں کو ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہیں، جس میں وہ ہر لمحہ اپنی آبرو کو غیر محفوظ پائیں، جس میں اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے بھی انہیں رشوتیں دینی پڑیں جس میں وہ ہر لحظہ سماج دشمن عناصر کے جبر و استبداد کی بھینٹ چڑھتے رہیں۔ اس کے عوام خاک ترقی کر سکتے ہیں۔ کوئی قوم خداداد صلاحیتوں کو یکسوئی کے ساتھ اسی صورت میں تعمیر و ترقی کی راہ پر لگا سکتی ہے جب اسے ذہنی طور پر سکون حاصل ہو اور اس کا ہر فرد اس بات کا اطمینان رکھتا ہو کہ اس کی جان، اس کا مال اور اس کی عزت و آبرو کو پورا پورا تحفظ حاصل ہے۔ عدمِ تحفظ کا احساس تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے بجائے تخریبی قوتوں کی آبیاری کرتا ہے اور انسان مثبت انداز میں سوچنے اور تعمیری انداز میں عمل کرنے کے بجائے منفی انداز میں سوچنے اور تخریبی انداز میں عمل کرنے لگتے ہیں۔ ہم صاحبِ صدر کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ وہ جلد از جلد اس کی فکر کریں کہ لوگوں کے اندر عدمِ تحفظ کا جو احساس بڑی شدت سے پیدا ہو گیا ہے وہ دُور ہو اور اس کی جگہ اُن کے دلوں میں احساسِ تحفظ جڑ پکڑے۔ ہم انہیں اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں جو تعمیری قدم بھی اٹھائیں گے پوری قوم اس معاملے میں ان کی معاون و مددگار ہو گی۔

ایک اور سنگین مسئلہ جو قابلِ اطمینان حل کے لیے ان کے ناخنِ تدبّر کا محتاج ہے وہ معاشی بدحالی اور تشویشناک حد تک بڑھتی ہوئی بیروزگاری کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ یوں تو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی عوام کے لیے وجہِ پریشانی بنا رہا ہے اور کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا جس میں اس کے بارے میں لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو لیکن گذشتہ تین چار سالوں میں اس مسئلہ نے غیر معمولی طور پر سنگین صورت حال اختیار کر لی ہے۔ محنت کش کام کرنا چاہتے ہیں مگر انہیں کام نہیں ملتا اور ملتا بھی ہے تو اس سے اس قدر

کم یافت ہوتی ہے کہ وہ اس سے جسم و روح کے رشتے کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ صدر صاحب یقین جانیے یہاں کے عوام انسان نہیں بلکہ سانس لیتی لاشیں ہیں۔ وہ مایوسی کی تصویر ہیں۔ فاقہ مستی ان کی صلاحیتوں کو اس طرح چاٹ گئی ہے جس طرح دیمک لکڑی کو چاٹ جاتی ہے۔ یہ لوگ جس انداز سے غربت اور افلاس کا شکار ہو کر اپنی قوتوں کو ضائع کر رہے ہیں اس کے تصور سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔ صاحبِ صدر کو ان لوگوں کے حالات کو بہتر بنانے کی کوئی سبیل سوچنی چاہیے اور جذباتی اقدامات کے بجائے اس راہ میں کوئی ٹھوس اقدامات کرنے چاہییں۔ معاشی میدان میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کسی طرح پیداوار کی مشینری جو جامد ہو چکی ہے اُسے پھر سے متحرک کیا جائے۔ اس کے لیے فوری طور پر چار ضرورتیں ہیں: خام مال کی فراہمی کا معقول بندوبست، تیار کردہ مال کی کھپت کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش، سرمایہ کا حصول اور پیدائشِ دولت میں کارکنوں کے لیے ایسے منصفانہ حصے کا تعین جس سے نہ صرف وہ زندگی کی بنیادی ضروریات حاصل کر سکیں بلکہ اپنی استعدادِ کار بھی بڑھا سکیں اور اپنی صلاحیتوں کو ہنگاموں اور شورشوں کی نذر کرنے کے بجائے ملک کی تعمیر و ترقی میں کھپا سکیں۔

صاحبِ صدر اس سلسلے میں جو خدمت بھی پاکستان کے کسی فرد سے لینا چاہیں ہمیں یقین ہے وہ اسے بڑی خوشی سے انجام دینے پر آمادہ ہو گا۔

صدرِ مملکت اور ان کے وزراء اور مشیروں کی فوج ظفر موج ملک کی تعمیرِ نو کے لیے اس وقت جو منصوبے تیار کر رہی ہے وہ خواہ کتنے ہی خوش آئند ہوں مگر پاکستان کا ہر شہری اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہے کہ وہ پاکستان کی نظریاتی اساس یعنی اسلام جو اس کے وجود کا واحد جواز، اس کی قوت کا واحد سرچشمہ اور اُس کی ترقی کی واحد ضمانت ہے۔ کو کافی حد تک نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محترم بھٹو صاحب نے ایک دو مرتبہ اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اقدار اور اسلامی نظامِ حیات کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس مسئلے میں کوئی عملی اقدام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی درآنحالیکہ انہیں اس کام کی طرف فوری توجہ دینی چاہیے تھی کیونکہ غیر اسلامی طرزِ زندگی کی تباہ کاریوں کا پوری قوم حال ہی میں مشاہدہ کر چکی ہے۔ ہم صاحب صدر سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ اس معاملے میں ہاتھوں پر سرسوں جما دیں۔ مکمل اسلامی نظام کے قیام کے لیے بلاشبہ انہیں کچھ

مہلت ملنی چاہیے کیونکہ غیر اسلامی نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ مکمل اسلامی نظام کا قیام محنت طلب کام ہے لیکن ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس نیک کام کے آغاز کے لیے کیوں تاخیر کی جا رہی ہے جبکہ اس کے شروع کرنے کے لیے اس وقت حالات بھی بڑے سازگار ہیں۔ شراب و شاہد کے رسیا حکمرانوں کے ہاتھوں ملک کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اس سے عوام کے اندر بُرائیوں کے خلاف شدید نفرت کا احساس پیدا ہوا ہے۔ اگر صاحبِ صدر اپنے وسیع اختیارات سے کام لے کر بعض صنعتوں کو حکومت کی تحویل میں لینے کا انقلابی قدم اٹھا سکتے ہیں، ملک کی بعض اُونچی اور با اثر شخصیتوں، جن میں سابق جرنیل بھی شامل ہیں، کی آزادی سلب کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اُن برائیوں کے استیصال کا بندوبست نہ کر سکیں، جنہوں نے قوم کو زبردست تباہی سے ہمکنار کیا ہے اور جن کے مضر اثرات کو پاکستان کا ہر بہی خواہ نہ صرف پوری شدت سے محسوس کر رہا ہے بلکہ اُنہیں ختم کرنے کا دل و جان سے آرزو مند بھی نظر آتا ہے۔ صدر صاحب کے لیے کام کا یہ میدان ایسا ہے جس میں اختلاف کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ شاہد و شراب کو ختم کرنے کے لیے وہ جو سخت سے سخت قدم بھی اُٹھائیں گے پوری قوم اُن کی تائید کرے گی اور خدا کے حضور میں ان کی سلامتی کے لیے دُعا گو ہو گی۔ وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام کر کے تو دیکھیں پھر اُنہیں قوم کے جذبات کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔